جناب ضیاء الدین لاہوری

تذکرہ ہائے سر سید میں تضاد اور بد دیانتی کی چند مثالیں

مطالعہ سر سید کے دوران میں بعض ایسے مقامات آتے ہیں جہاں قاری سخت الجھن میں پڑ جاتا ہے وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ مضمون نگار یا مولف کی زیر مطالعہ باتوں پر یقین کرے یا اس کی کسی دوسرے موقع کی متضاد تحریر کو سچ مانے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی خاص مسئلے کے ضمن میں سر سید کے ''کارنامے'' کے طور پر بیان کردہ اسکا تجزیہ درست ہے یا اس ''کارنامے'' کے رد میں سر سید کا بیان قابل قبول ہے۔ جب وہ قومی نقطہ نظر سے لکھی گئی تاریخ کی باتوں کا سر سید کے اقوال و اعمال کے ساتھ موازنہ کرتا ہے تو انہیں ایک دوسرے کی ضد پا کر پریشان ہو جاتا ہے۔ میں اپنے تعلیمی نصاب کے شکار اس معصوم قاری کی بات نہیں کر رہا جو ہمارے موجودہ تعلیمی ماحول میں مخصوص حلقوں کی ہر بات تسلیم کرنے پر مجبور ہے' میرا مطلب اس قاری سے ہے جو مطالعہ کرتے ہوئے اپنے ذہن سے 'ہاں_____ اپنے ذہن سے' سوچتا ہے اور موضوعات سے متعلق سیاق و سباق کو بھی مد نظر رکھتا ہے۔ مگر چونکہ وہ بھی تعلیمی نصاب کی تکمیل کے مراحل سے گزر کر اس مقام تک پہنچا ہے اور یوں اجتماعی ذہنی دھلائی کے غیر محسوس عمل کے زیر اثر بھی رہا ہے اس لئے آزادانہ سوچ کے آغاز میں اس کی پریشانی ایک قدرتی امر ہے۔ یہ کیفیت اسے اصل مآخذ کی ورق گردانی پر آمادہ کرتی ہے اور تمام حالات پر غور کر کے وہ بالآخر حقائق تک پہنچ ہی جاتا ہے اس کے برعکس نصاب زدہ قاری اس تردد میں پڑنے کی زحمت گوارا کرنا ضیاع اوقات سمجھتا ہے اور کولہو کے بیل کی مانند موجودہ نصاب کے کھونٹے کے گرد چکر لگاتے رہنے ہی کو فخر سمجھتا ہے۔ سہل پسندی اسے تحقیق کی طرف متوجہ نہیں کرتی۔ اگر وہ اپنا نام خود ساختہ دانشوروں کی فہرست میں شامل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کا تعصب مزید قوی ہو جاتا ہے اس صورت میں اس کے سامنے بے شک حقائق کا انبار لگا دیا جائے' وہ اپنے تعصب کو ذہن سے نہیں نکالتا بلکہ رٹے رٹائے جملوں سے ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ سر سید احمد خان کی شخصیت اور ان کے افکار پر بے شمار مقالے لکھتا ہے' کتابیں تالیف کرتا ہے مگر انکی اہم تصانیف کا مطالعہ تو کجا' انہیں ہاتھ لگانے کی بھی نوبت نہیں آنے دیتا کیونکہ اس موضوع پر جو کچھ اس کے ذہن میں پختہ ہو چکا ہے وہی اس کا علم اول تا آخر ہے وہ اسے ہی مکمل سمجھتا ہے اور مزید مطالعے کو اپنی توہین سمجھتا ہے لہذا اس کی تمام ''تخلیقات'' الفاظ کے الٹ پھیر سے گھوم پھر کر ایک ہی مخصوص نکتے پر آن جمع ہوتی ہیں۔ اس کا محدود علم ہی اس کی دانش وری کی بنیاد ہے اس لئے وہ حقائق قبول کر کے اپنی دانش وری کو داؤ پر نہیں

لگا سکتا۔ اسے خدشہ ہوتا ہے کہ اس طرح اسے اپنی سابقہ تحریروں کا رد کرنا پڑے گا اور اسکی "قدر و قیمت" نہیں رہے گی۔ حقائق کو قبول نہ کرنے کے سبب اس کی تحریروں میں تضاد جنم لیتا ہے مگر وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی لاعلم رہنے ہی میں اپنی "عافیت" سمجھتا ہے یا پھر "میں نہ مانوں" کی گردان الاپتا رہتا ہے۔

سر سید احمد خان کی شخصیت انکے بعض اختلافی تعلیمی وسیاسی افکار اور مذہبی عقائد کے باعث انکے عہد ہی سے متنازعہ فیہ چلی آرہی ہے انکے پرستار اہل قلم افراد کی جذباتی تحریروں نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کو بُری طرح متاثر کر رکھا ہے۔ بعض نامور اساتذہ اور معروف دانش ور اپنے لیکچروں اور مقالوں میں انکے متنازعہ کردار کے بارے میں لفّاظی کے وہ جوہر دکھاتے ہیں کہ اصل مسئلہ دبا دیا جاتا ہے اور صرف ہمدردانہ جذبات ابھارے جاتے ہیں۔ وہ علمی دلائل تسلیم نہیں کرتے بلکہ محض عقیدت کے سہارے مفروضے قائم کرتے ہیں۔ یہ رویہ موجودہ دور میں ہی نہیں اپنایا گیا' ہم اسے سر سید کے رفقا میں بھی موجود پاتے ہیں۔ ذیل میں چند مشہور شخصیات اور مصنفین کی تقریروں اور تحریروں سے وہ اقتباس پیش کئے جاتے ہیں جن میں واضح طور پر تضاد پایا جاتا ہے۔

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

ہمارے بعض قلم کار جب شخصیت پرستی کے زیر اثر مطالعے کے بغیر قلم اٹھاتے ہیں تو بعض اوقات تخیلاتی واقعات کو جنم دیتے ہیں اور ایسے قصے بیان کرتے ہیں جن کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہوتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تاریخ گھڑنے سے انکا مقصد پورا ہو جائے گا حالانکہ اس طرح خود انکی اپنی "قابلیت" کا بھانڈا بیچ چوراہے کے پھوٹتا ہے۔ نظریاتی کشمکش میں نام پیدا کرنے کے شوقین ایک نامور اہل قلم "پروفیسر رفیع الدین شہاب" کی ایک تحریر میں اسی قسم کی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ آپ نے سر سید کی تفسیر القرآن کی اشاعتِ نو کا اہتمام کیا تو اس کے تعارف میں سر سید کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" کے متعلق لکھا:

"اس کتاب کے لکھنے پر انہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی' لیکن چونکہ یہ کتاب حقائق پر مبنی تھی اسلئے انگلستان کے بعض انسان دوست انگریزوں نے کوشش کر کے انکی یہ سزا معاف کرادی" (۱)

شاید موصوف کو یہ علم نہیں کہ نہ سر سید کو پھانسی کی سزا سنائی گئی اور نہ ان پر کسی قسم کا کوئی مقدمہ قائم ہوا' یہاں تک کہ اس سلسلے میں کبھی ان سے کوئی باز پرس بھی نہیں ہوئی' سزا معاف کروا دینے والے انگلستان کے انسان دوست انگریز اس قصے میں یونہی گھسیڑ دئے گئے۔ خدا جانے انہوں نے کس اثر کے تحت یہ حکایت تخلیق کر ڈالی؟ اس کتاب کی اشاعت پر "زیادہ سے زیادہ" جو ردعمل ہوا' وہ سر سید کے معتقدِ اعلیٰ الطاف حسین حالی کے درج ذیل الفاظ میں حقیقت حال کی بخوبی وضاحت کرتا ہے:

"گورنمنٹ انڈیا میں جب یہ کتاب پہنچی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہوئی تو لارڈ کیننگ گورنر جنرل اور سر بارٹل فریر نے' جو کونسل میں ممبر تھے' اس کے مضمون کو محض خیر خواہی پر محمول کیا مگر مسٹر سسل بیڈن نے' جو اس وقت فارن

سیکرٹری تھے' اس کے خلاف بہت بڑی سپیچ دی اور یہ رائے ظاہر کی کہ اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے اسے حسب ضابطہ باز پرس ہونی چاہیے اور جواب لینا چاہیے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہیے۔ لیکن چونکہ اور کوئی ممبر انکا ہم رائے نہ تھا۔ اس لئے انکی سپیچ سے کوئی مضر نتیجہ پیدا نہیں ہوا۔"(۲)

جب وقت کا گورنر جنرل "اسباب بغاوتِ ہند" کے مضمون کو محض خیر خواہی پر محمول کر رہا تھا اور کونسل کا کوئی بھی رکن صرف ایک اہل کار کی "غضب ناک تقریر" کا ہم نوا نہ تھا تو انہیں کون نقصان پہنچا سکتا تھا؟ اسکے برعکس ہمارے پیشہ ور اہل قلم سر سید کے متعلق متذکرہ بے ضرر مخالفانہ رائے کو بنیاد بنا کر اپنے مضامین میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ اس کتاب کی اشاعت پر انگریز حکمران ان کی جان کے دشمن ہو گئے تھے۔

آگے چل کر پروفیسر صاحب نے علمائے دین کی علمی چوریاں پکڑنے کا دعویٰ کیا ہے اور ایک چوری کا انکشاف ان الفاظ میں کیا ہے :

"مسئلہ جبر و قدر..... پر مودودی صاحب کا کتابچہ "مسئلہ جبر و قدر" شائع ہوا تو اسکی بڑی تعریف کی گئی حالانکہ مودودی صاحب نے اسے لفظ بہ لفظ سر سید احمد خان صاحب کی تفسیر سے نقل کیا تھا۔ بس اس میں یہ اضافہ کیا تھا کہ کتابچے کے شروع میں اسکی تائید و مخالفت میں پیش کی جانے والی آیات کو نقل کر دیا لیکن جب اصل مسئلہ پیش کیا گیا تو وہ لفظ بہ لفظ وہی تھا جو سر سید احمد خان صاحب نے پیش کیا تھا۔"(۳)

اس الزام کی حقیقت جاننے کے لئے حساس قارئین نے سید ابوالاعلیٰ مودودی کے متذکرہ کتابچے کا کونہ کونہ چھان مارا مگر انہیں سخت مایوسی ہوئی۔ دیگر قارئین بھی پروفیسر صاحب کا برآمد کردہ چوری کا مال "لفظ بہ لفظ" دیکھنے کے شدت سے متمنی ہیں۔ فاضل مدعی کو چاہیے تھا کہ بغیر ثبوت بات کرنے کی بجائے بطور نشان دہی اپنے دعویٰ کا کوئی ہلکا سا حوالہ پیش کر دیتے کیونکہ شہادت کے بغیر کوئی الزام ذرا بھی وقعت نہیں رکھتا بلکہ "تہمت کے زمرے میں آتا ہے۔ پروفیسر صاحب موصوف نے اسی "تعارف" میں ایک اور انکشاف کیا ہے کہ سر سید نے :

"اسوقت کے مشہور عالم دین شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ سے فتویٰ دلوایا کہ انگریزی کی تعلیم حاصل کرنا گناہ نہیں۔"(۴)

جناب سلیم منصور خالد نے ایک مجلّہ میں انکی اس تحقیق پر یہ رائے دی :

"پروفیسر رفیع اللہ شہاب کی اس نادر روزگار تحقیق پر داد نہ دینا ظلم ہے۔ سید احمد خان 1817ء میں پیدا ہوئے اور جب وہ سات برس کے تھے تو شاہ عبدالعزیز دہلوی ابن شاہ ولی اللہ فوت ہوئے۔ انکار حدیث کے قلم بھف لکھاری کی چشم تخیل نے سات برس کے سید احمد کے ہاتھوں شاہ عبدالعزیز کو فتویٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ تحقیق' تخیل اور خواہشات کی اسارت کا یہ نمونہ خاصے کی چیز ہے۔"(۵)

درج بالا تبصرے کی اشاعت کے بعد متذکرہ تفسیر کی اگلی اشاعت میں فتوے سے متعلق عبارت کو ان الفاظ میں تبدیل کر دیا گیا۔

"انہوں نے شاہ عبدالعزیز محدث کے ایک فتوے کی طرف لوگوں کی توجہ دلائی کہ انگریزی کی تعلیم حاصل کرنا گناہ

نہیں۔"(۶)

مزے کی بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب موصوف کے "تعارف" کی تحریر جو یک اگست 1994ء کی لکھی ہوئی ہے اگلی اشاعت میں بھی وہی رہی مگر اس میں جو تبدیلی کی گئی گو اسکے بعد کی ہے مگر وہ بھی اس تاریخ کی لکھی ہوئی ظاہر کی گئی ہے۔ دیانت داری کا تقاضا تھا کہ اسے تبدیل کرتے ہوئے حاشیے میں اس امر کی وضاحت کی جاتی اور اپنی غلطی تسلیم کی جاتی۔ اسکے برعکس دیکھا جائے تو موصوف کے ممدوح اس معاملے میں نہایت عالی ظرف واقع ہوئے تھے۔ انکی اس صفت کی ایک مثال حاضر ہے۔ سرسید اپنی ایک علمی غلطی کا اقرار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

'ابطال غلامی کا آرٹیکل جو تہذیب الاخلاق کے متعدد پرچوں میں چھپا ہے اور جس کا نام "تبرية الاسلام عن شين الامة والغلام" ہے' اس آرٹیکل میں ایک بڑی غلطی ہم سے ہو گئی ہے یعنی اس کے باب ہفتم میں بہ ذیل بیان ازواج مطہرات کے ہم نے ایک حدیث صحیح مسلم سے 'نسبت حضرت جویریہ کے نقل کی ہے۔ افسوس ہے کہ جس کتاب سے ہم نے حدیث کو نقل کیا' اس میں غلطی تھی..... افسوس ہے کہ ہم نے اپنی جہالت سے اسی غلط عبارت کی پیروی کی۔ اسی کو نقل کیا اور اسی کو بطور ایک اختلاف کے لکھ دیا۔ پس ہم اس خطا کا اور اپنی جہالت کا اقرار کرتے ہیں ..... ہم اپنے شفیق مولوی علی بخش خان صاحب سب آرڈینیٹ جج گورکھ پور کا شکر ادا کرتے ہیں۔ جن کے فرمانے سے ہم اس غلطی سے متنبہ ہوئے"۔(۷)

واضح ہو کہ مولوی علی بخش خان سرسید کے سب سے بڑے دو مخالفین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے حرمین شریفین جاکر سرسید کے خلاف کفر کے فتوے جاری کروائے۔ یہاں سرسید نے اپنی غلطی کا اقرار جن الفاظ میں کیا' اسے پڑھ کر رشک آتا ہے۔ کاش' ان کے معتقد ایسی صورت حال میں ان کی ہلکی سی تقلید کا کوئی نمونہ پیش کر کے اپنی قابلِ احترام شخصیت کی روح کو سکون پہنچاتے!

ڈاکٹر فوق کریمی:

"اسباب بغاوت ہند" مطبوعہ 1985ء میں ڈاکٹر فوق کریمی کے مقدمہ کے آخر میں درج ذیل عبارت تحریر ہے

"1915ء میں جب گاندھی جی کانگرس میں شریک ہوئے تو انکے دل میں مسلمانوں کیلئے بڑی وسعت تھی۔ وہ حق بات کہنے کے باعث ہمیشہ فرقہ پرست کانگرسیوں کی نظر میں کھٹکتے رہے اور 1920ء میں جب مسلمانوں کی طرف سے خلافت تحریک شروع ہوئی اور اس تحریک نے حکومت کے خلاف بدیشی مال کا بائیکاٹ اور انگریزی حکومت کی نوکریوں سے مستعفی ہونے کا پروگرام بنایا تو مسلمانوں نے اس تحریک میں گاندھی جی کو اپنا رہنما بنا کر مہاتما گاندھی کا لقب دیا اور گاندھی جی اور مسلم رہنماؤں کی کوششوں سے مسلم لیگ اور کانگرس میں ایسا اتحاد پیدا ہو گیا کہ ہندو اور مسلمان آپس میں ایسے بھائی بھائی ہوئے کہ مسلمانوں نے مہاتما گاندھی اور شردھانند جیسے آریہ سماجی لیڈر کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر دہلی کی جامع مسجد کے منبر پر کھڑا کر کے ان کی تقریر بھی سنی۔ لیکن بدقسمتی سے خلافت کمیٹی نے گاندھی جی کی سربراہی میں جو ہندو مسلم اتحاد پیدا کیا تھا' وہ فرقہ پرست کانگرسیوں کی وجہ سے زیادہ

عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ 1947ء میں ملک آزاد ہو گیا اور انگریز کا پرچم لال قلعہ سے اتار کر کانگرس کا سہ رنگی قومی پرچم لہرا دیا گیا جو اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ ہندوستان کی عظمت و بلندی کی نشاندہی کر رہا ہے۔ سرسید نے "اسباب بغاوت ہند" 126 سال قبل لکھ کر ہندوستانیوں کو جو آزاد پارلیمنٹ کا خواب دکھایا تھا آج اس کی جیتی جاگتی تصویر آزاد ہندوستان کا پارلیمنٹ ہے۔ آج اس میں سرسید کے بھول خود ہندوستانی بناتے ہیں اور خود اس پر عمل کرتے ہیں ....."(۸)

اسی کتاب کا فوٹو سٹیٹ ایڈیشن 1991ء کے حوالے سے پاکستان میں طبع ہوا تو اس میں درج بالا تحریر کو اس طرح بدل دیا گیا:

" لیکن تقسیم سے پہلے کانگرس کے ارباب اقتدار نے آزادی کے بعد سرسید کے جداگانہ انتخاب کے نعرہ کو باقاعدہ اپنا کر نہ صرف اسے دستوری حیثیت دی بلکہ دستور ساز اسمبلیوں میں ریزرویشن کے ذریعہ نمائندے بھی لے گئے اور انہیں سرکاری ملازمین میں ریزرویشن بھی دیا گیا۔ آج ہندوستان کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقے کے افراد حکومت سے اپنے اپنے لئے جداگانہ ریزرویشن اور جداگانہ ملازمتوں کی مانگ کر رہے ہیں۔ سرسید نے "اسباب بغاوت ہند" 132 سال قبل لکھ کر حکومت وقت سے یہ شکایت کی تھی کہ ہندوستانیوں کو لجسلیٹو کونسل میں نمائندگی نہیں دی جاتی اور نہ انہیں سرکاری ملازمتوں میں اعلیٰ عہدے دئے جاتے ہیں۔ حکومت نے سرسید کی دونوں باتوں کو تسلیم کیا اور سرسید نے یہ بھی پیش گوئی کی تھی کہ وقت آئے گا جب تم اس ملک کا خود قانون بناؤ گے اور خود اس پر عمل کرو گے۔ آج ہند و پاکستان میں قانون ساز مجالس سرسید کی پیش گوئی کی منہ بولتی تصویریں ہیں ..... (۹)

چھپن صفحات کے مقدمہ میں محض چند سطروں کی عبارت میں تبدیلی کا پس منظر کیا ہے؟ کیا عبارت اول فاضل مصنف کے قومی مسلک کے مطابق نہیں تھی یا پھر انہوں نے "گنگا گئے تو گنگا رام اور جمنا گئے تو جمنا داس" کی ضرب المثل کی پیروی کی؟ بہر حال یہ واقعی بڑی کاریگری کی بات ہے۔ کہ ایک مصنف اپنی پسندیدہ لیکن متنازعہ شخصیت کو تسلیم کروانے کے لئے دو قوموں کے متضاد قومی اور جذباتی ذہنوں کے مطابق جدا جدا اوزاروں سے کام لے! اسی طرح سرسید کے نظریہ قومیت کے بارے میں ڈاکٹر فوق کریمی کی تحریروں میں بہت بڑا تضاد ملتا ہے۔ انہوں نے 1958ء میں "اسباب بغاوت ہند" کی اشاعت اول کا انتساب ان الفاظ میں تحریر کیا:

"سرسید کی روح کے نام جس نے ہندوستانیوں کو متحدہ قومیت کا درس دیا۔"(۱۰)

لیکن 1985ء میں اپنے مقدمے میں ایک جگہ اسکے برعکس یوں لکھا:

"سرسید جو ہندو اور مسلمانوں کو اپنی ایک آنکھ اور ہندوستان کو ایک دلہن سے تشبیہ دیتے تھے دوسرے انہوں نے ہندو اور مسلمانوں کو ایک قوم بار بار بتایا لیکن جب بنارس میں کچھ ہندوؤں نے اردو کے خلاف آواز بلند کی تو ان کے دل کو اس آواز اور تحریک سے سخت چوٹ پہنچی جس نے سرسید کے متحدہ قومیت کے نعرے کو متزلزل کر دیا۔" (۱۱)

یہ لکھتے ہوئے موصوف بھول گئے کہ انہوں نے ایڈیشن اول کے مقدمہ میں متحدہ قومیت کے حق میں کئی صفحات پر مشتمل سرسید کے جن تقریروں کے اقتباسات پیش کئے تھے۔ وہ انہوں نے 1884ء میں پنجاب کے سفر کے موقع پر کی تھیں۔ بنارس کا واقعہ 1867ء کی بات ہے لہذا اس سے سترہ سال بعد کے متحدہ قومیت

کے حق میں نعرے، سترہ سال قبل کیسے متزلزل ہو گئے ؟ تضاد سے پُر اس فلسفہ پر سرسید کے شیدائی ہی کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں!

ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ :

سرسید کی ایک نہایت عقیدت مند شخصیت خان بہادر ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ نے "سرسید کا مذہب' کے عنوان سے سرسید کی وفات کے موقع کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"..... میں یہ بھی شہادت دیتا ہوں کہ جب انکا وصال ہوا تو جنازے کی نماز میں کالج کے طلبہ اور علی گڑھ شہر کے بہت سے لوگ آکر شریک ہوئے۔ ایک شخص جلدی سے ہمارے ایک عالم مولوی الطاف علی کے پاس آئے (مولوی الطاف علی صاحب ہمارے سکول میں معلم تھے) اور ان سے دریافت کیا کہ "سرسید پر کفر کا فتویٰ لگا ہوا ہے ان کے جنازے کی نماز حرام۔ آپ نماز میں شریک ہونگے یا نہیں اور مجھے کیا رائے دیتے ہیں ؟" مولوی الطاف علی صاحب نے فرمایا کہ "سرسید نہایت پکے مسلمان تھے اور شاہ غلام علی دہلوی کے مرید تھے۔ انکے جنازے کی نماز پڑھنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔" جس شخص نے سوال کیا تھا اس نے کہا کہ "اگر سرسید شاہ غلام علی دہلوی کے مرید تھے تو میں ضرور نماز میں شریک ہونگا" اور وہ فوراً صف میں کھڑا ہو گیا اور نماز جنازہ ادا کی۔" (۱۲)

ان الفاظ پر ڈاکٹر شیخ عبداللہ کی تحریر ختم ہو جاتی ہے اس واقعہ کے بیان سے انہوں نے ایک تیسرے شخص کی زبانی قارئین کے ذہن میں یہ بات جمانا چاہی ہے کہ سرسید شاہ غلام علی کے مرید تھے۔ اس سے غالباً انکا مقصد یہ ہے کہ اس طرح سرسید سے عوامی عقیدت کی راہ ہموار ہو گی۔ حیرت ہوتی ہے کہ سرسید سے براہ راست مراسم رکھنے والا شخص' جو متذکرہ مضمون کے شروع میں مطبوعہ اپنے خط میں انکی ایک اہم رائے کا امین ہونے کا دعویٰ کرتا ہے انکے معاملے میں صحیح صورت حال سے اس قدر بے خبر بھی ہو سکتا ہے۔ سرسید نے خود اپنی تاریخ پیدائش 5 ذی الحجہ 1232ھ بتائی ہے (۱۳) جبکہ شاہ غلام علی کی تاریخ وفات 22 صفر 1240ھ بیان کی ہے (۱۴) یعنی اس وقت سرسید کی عمر صرف سات برس تھی۔ اس چھوٹی سی عمر میں انہیں ایک نامور شیخ کا مرید ظاہر کرنے کا اعزاز عطا کرنا سرسید کے عقیدت مندوں کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے! مرید ہونا تو ایک طرف رہا' سرسید خود شاہ غلام علی سے اس عقیدت سے بھی انکار کرتے ہیں۔ جو ایک مرید کو مرشد کے ساتھ ہوتی ہے۔ حالی لکھتے ہیں :

"سرسید نے ایک دفعہ شاہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے میرے سامنے یہ کہا تھا کہ "گو اس قسم کی عقیدت جیسی مریدوں کو اپنے شیخ کے ساتھ ہوتی ہے' مجھ کو نہیں ہے لیکن نہایت قوی تعلق اور رابطہ' اخلاص' میرے دل میں شاہ صاحب کے ساتھ' اور میں چاہتا ہوں کہ میری لائف میں اس بات کی تصریح کی جائے۔" (۱۵)

اور حالی نے ان کی یہ آرزو ان کی سوانح میں پوری کر دی مگر ان سے قریبی تعلق رکھنے والے بعض شیدائی اس سے آگاہ نہ ہو سکے۔

ڈاکٹر اے۔ ایچ۔ کوثر :

سر سید پرست قلم کار سر سید کے بعض فقرات کے نت نئے مفہوم وضع کرنے میں خاصا ملکہ رکھتے ہیں۔ ان کا ایک طریقہ واردات یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں تحقیقی تاثر پیدا کرنے کے لئے بعض بے ضرر حوالے صحیح طور پر بھی نقل کرتے ہیں۔ مگر جہاں انکے ممدوح کی سوچ صریحاً منفی ثابت ہوتی ہو وہاں سیاق و سباق کی کانٹ چھانٹ کرنے کے علاوہ الفاظ کو تبدیل کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ایسے مواقع پر وہ حوالوں کی صحیح نشان دہی نہیں کرتے بلکہ صرف کتاب کا نام لکھ کر اپنی دانشوری کا بھرم قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو زیادہ ''دیدہ دلیر'' ہوتے ہیں وہ تصوراتی پروازوں کے ذریعے سر سید کے منہ سے وہ کچھ اگلواتے ہیں جو انہوں نے کبھی نہیں کہا ہوتا بلکہ ان کی فکر سے بالکل متضاد ہوتا ہے۔ اس کاروائی سے ان کا مقصود محض اپنے ہیرو کی پرستش کروانا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اے۔ ایچ۔ کوثر نے اپنے ایک مقالے میں اس ''فن'' سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ وہ ''اسباب بغاوت ہند'' کے حوالے سے سر سید کی ''مبینہ'' جرأت مندی کے خود ساختہ انکشافات منظر عام پر لائی ہیں۔ بات اپنی ہے مگر یوں بیان کرتی ہیں جیسے کہ یہ سب کچھ سر سید نے کہا ہو۔ قاری کو یہ تاثر دیتی ہیں کہ ان کی بیان کردہ توضیح دراصل سر سید کی سوچ اور انہی کے الفاظ ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے :

''سر سید احمد خان نے سرکشی کا مفہوم واضح کیا کہ سرکشی کسے کہتے ہیں؟ اپنی حکومت کی اطاعت نہ کرنا' اس سے مقابلہ کرنا اور گورنمنٹ کے اصول و قواعد کے خلاف عمل کرنا سرکشی ہے لیکن یہ حکومت ہندوستانیوں کی اپنی نہ تھی بلکہ دھوکے اور فریب سے ان کے ملک پر قبضہ کیا گیا تھا لہٰذا آزادی کے حصول کی جدوجہد کو سرکشی نہیں کہا جاسکتا۔ گورنمنٹ کو ہندوستان اور ہندوستانیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ ملک اور ہندوستانی عوام کو ہر لحاظ سے کمزور تر کرنا ان کا مقصد نظر آتا تھا۔ رعایا میں علمی روشنی عام کرنے کی بجائے جہالت کی تاریکی کو اپنی حکومت کے حق میں بہتر سمجھتے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ تعلیم عام کرنے سے ہندوستانیوں میں سیاسی شعور پیدا نہ ہو جائے۔ جو انکی حکومت کی پائیداری کے لئے خطرہ کا باعث ہو۔ انگریز ہندوستانیوں کو ذلیل سمجھتے تھے ان کی توہین کا کوئی پہلو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ سپاہیوں سے یہ کہنا کہ تم کانوں میں بالیاں نہ پہنو' ڈاڑھی منڈاؤ' پگڑی کی بجائے وردی کی ٹوپی پہنو' پھر چربی والے کارتوسوں کا واقعہ جن کے متعلق ان کو یقین ہو چکا تھا کہ اس میں ہندو مسلم دونوں کے مذہبی نکتہ نظر کے خلاف گائے اور سور کی چربی استعمال کی گئی ہے' ان کارتوسوں کے استعمال پر زور طاقت اصرار کیا گیا لہٰذا کسی غاصب حاکم کے خلاف احتجاج کرنا سرکشی میں داخل نہیں جو زبردستی ان پر مسلط ہو گیا ہو۔''

''انہوں نے بتایا کہ ملازمتوں کے سلسلے میں مسلمانوں کو سراسر نظر انداز کیا گیا جس سے ان میں بے چینی و بے اطمینانی کا پھیلنا یقینی تھا۔ انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کا بہادر شاہ ظفر کا ساتھ دینا ان کے اس شبہ کو تقویت دیتا تھا کہ مسلمان بہادر شاہ ظفر کو بادشاہ بنا کر انگریزوں کو اس ملک سے نکال کر اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ سید احمد خان نے واضح کیا کہ اگر بادشاہ کے دل میں بادشاہت کی خواہش دوبارہ پیدا بھی ہوئی اور اسی نظریہ کے تحت انہوں نے حریت پسندوں کا ساتھ دیا ہو تو بھی اسے بغاوت نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ملک انکا تھا' حکومت ان کی تھی انگریزوں نے طاقت کے بل بوتے پر قبضہ جما رکھا تھا اور ہندوستانیوں کیساتھ کبھی ہمدردی و انصاف کا برتاؤ نہ کیا تھا۔ کبھی انکی بہتری و ترقی کو مدنظر نہ رکھا بلکہ ہندوستانیوں کو ذلیل سمجھا' ان کے اوپر قوانین بھی

ایسے مسلط کر دئے گئے تھے جو انکے مزاج' رسم ورواج اور ان کے مذہب وآئین کے خلاف تھے۔"(۱۶)

درج بالا باتیں یا انکا ہلکا سا مفہوم بھی سر سید کی "اسباب بغاوت ہند" میں کہیں موجود نہیں۔ یہ سراسر ڈاکٹر صاحبہ کی ذہنی اختراع ہے جو ممکن ہے کہ انکے مقالے کے مشہور و معروف معاونین (جن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری سر فہرست ہیں) کے مشورے سے وجود میں آئی ہو۔ اسکے برعکس جب ہم اس تحریر کا سر سید کی فکر سے موازنہ کرتے ہیں تو سر سید کے درج ذیل بیانات محترمہ کی طرف سے ان پر ڈالی گئی "گرد" کو صاف کرنے کیلئے کافی ہیں :

"گو ہندوستان کی حکومت کرنے میں انگریزوں کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت نہ انہوں نے یہاں کی حکومت بہ زور حاصل کی اور نہ مکر و فریب سے بلکہ درحقیقت ہندوستان کو کسی حاکم کی اسکے اصلی معنوں میں ضرورت تھی' سو اسی ضرورت نے ہندوستان کو انکا محکوم بنادیا۔"(۱۷)

"وہ زمانہ جس میں انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی' ایک ایسا زمانہ تھا کہ بے چاری انڈیا بیوہ ہو چکی تھی۔ اسکو ایک شوہر کی ضرورت تھی' اس نے خود انگلش نیشن کو اپنا شوہر بنانا پسند کیا تھا..... انگلش نیشن ہمارے مفتوحہ ملک میں آئی مگر مثل ایک دوست کے' نہ بطور ایک دشمن کے۔"(۱۸)

"حق یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے نہایت شائستگی اور نرمی اور محافظت مذاہب مختلفہ حکومت کی۔ اس کی حکومت میں بجز اس کے اور کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ بادشاہانہ حکومت نہ تھی اور جس کی بڑی ضرورت تھی کہ ہندوستان میں ہو۔"(۱۹)

"اس ہنگامہ (۱۸۵۷ء) میں کوئی بات مسلمانوں کے مذہب کے موافق نہیں ہوئی"(۲۰)

دو قومی نظریے کی ابتداء سے متعلق ڈاکٹر صاحبہ مکتبہ ء فکر علی گڑھ کے مروجہ "معکوس" فلسفے کی ترجمانی کرتے ہوئے بیان کرتی ہیں کہ سر سید "ایک مدت تک ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم کہتے رہے۔" اسکی تائید میں وہ پہلے سر سید کے "آخری مضامین" سے ان کے انتقال سے چند ماہ پیشتر جون ۱۸۹۷ء میں شائع ہونے والے مضمون سے ایک حوالہ پیش کرتی ہیں۔ پھر تیرہ سال پیچھے ہٹتے ہوئے انکی ۱۸۸۴ء کی ایک تقریر کا اقتباس نقل کرتی ہیں۔ اسکے فوراً بعد مزید سترہ سال پیچھے جاکر بیان کرتی ہیں کہ :

"لیکن ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں نے اردو فارسی رسم الخط کی جگہ ہندی دیوناگری رسم الخط کو جاری کرنے کا مطالبہ کر کے ہندوستانی قوم میں پھوٹ ڈال دی جس سے "پہلی دفعہ" ان کو یہ اندازہ ہوا کہ ہندو مسلم کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا ناممکن ہے۔ اس لسانی تنازعہ نے نہ صرف فرقہ وارانہ منافرت و تفریق کو ہوا دی بلکہ ہندوستان کی سیاسی سطح پر تفریق کا پہلا پتھر نصب کر دیا۔ یہیں سے دو قومی نظریہ کا آغاز ہوتا ہے"۔ (۲۱)

متذکرہ معکوس فلسفے کا گمراہ کن انداز "ایجاد" کرنے کی سعادت حاصل کرنے کا سہرا دراصل علی گڑھ کے فکری ترجمان مولوی عبدالحق کے سر رکھا جاسکتا ہے۔ افسوس ہے کہ انکے "بے مغز دانش ور" پیروکار اس فلسفہ کے غیر حقیقی پہلو کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے یا پھر وہ اپنے بزرگ کی تقلید میں جان بوجھ کر تمام

کو گمراہ کرنے کا ''فریضہ'' انجام دے رہے ہیں۔ انکے تتبع میں بہت سے غیر فکری، شوقیہ اور نصابی وغیر نصابی پیشہ ور قلم کار بھی شخصیت پرستی کے زیر اثر دانستگی یا نادانستگی میں اس غیر حقیقی توجہ کو بنیاد بنا کر سرسید کو دو قومی نظریے کا خالق قرار دئے جارہے ہیں جس سے یہ فلسفہ حیرت انگیز طور پر پوری قوم میں زہر کی طرح سرایت کر رہا ہے۔

موصوفہ کی تحریروں میں متعدد جگہ تضاد کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ صرف ایک مثال پیش خدمت ہے۔ وہ سرسید کی ملی خدمات اجاگر کرنے کی غرض سے تحریر کرتی ہیں :

''۱۸۸۸ء میں ..... انہوں نے مسلمانوں کے سیاسی تحفظ کی خاطر علیگڑھ میں یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی۔''(۲۲)

پھر ایک اور جگہ انکے قلم سے نادانستگی میں سچی بات بھی نکل جاتی ہے۔

''سرسید نے ایک جماعت یونائیٹیڈ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن ۱۸۸۸ء میں (انجمن محبان وطن کے نام سے) بنائی جس میں ہندو مسلم دونوں شریک تھے۔(۲۳)

جب حقائق کا علم بھی ہو تو کیا حوالہ اول کا بیان بددیانتی پر مبنی نہیں؟ کیا یقین کیا جاسکتا ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے سیاسی تحفظ کی خاطر اس ایسوسی ایشن میں شرکت کی؟

رئیس احمد جعفری :

تضاد کی ایک واضح مثال رئیس احمد جعفری کی تحریروں میں بھی موجود ہے۔ ''حیاتِ محمد علی جناح'' میں ''غدر کے بعد پہلی آواز'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں :۔

''۱۸۵۷ء کے عالم آشوب غدر کے بعد مسلمانوں کی حالت حد درجہ یاس انگیز اور مایوس کن ہوگئی تھی، سہام انتقام کا ہدف انہی کا سینہ بنایا جارہا تھا، ہندو اور انگریز دونوں ان سے جلے ہوئے تھے اور اپنے پچھلے فرضی اور واقعی قرضے چکا رہے تھے۔ یہ حالت بیسویں صدی کے آغاز تک رہی۔ اس زمانہ میں نواب محسن الملک کی قیادت میں مسلمانوں کا ایک وفد شملہ پہنچا اور وائسرائے ہند کے سامنے اس نے ایک مفصل عرضداشت پیش کی...... وفد نے سب سے زیادہ زور جس چیز پر دیا تھا، وہ یہ تھا کہ قومی حیثیت سے مسلمانوں کی ایک جداگانہ جماعت ہے جو ہندوؤں سے بالکل الگ ہے۔ یہ ''غدر کے بعد مسلمانوں کی پہلی آواز'' تھی جو ایک قوم کی حیثیت سے بلند ہوئی تھی اور اس میں صاف صاف قومی انفرادیت پر زور دیا گیا تھا''۔(۲۴)

یہ اقتباس مصنف کی کتاب کے باب بعنوان ''دو قوموں کا نظریہ'' سے نقل کیا گیا ہے۔ کتاب ۱۹۴۶ء میں تصنیف ہوئی۔ پورے باب میں سرسید کا کہیں ذکر نہیں۔ قیام پاکستان کے بعد جب علیگ طبقے نے تعلیم اور ذرائع ابلاغ کے شعبوں پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے دو قومی نظریے کو سرسید سے منسوب کرنے کی فکر کی ترویج کی تو مصنف موصوف بھی اس پروپیگنڈے کے زیر اثر آگئے اور اپنی پچھلی تحریر کو فراموش کرتے ہوئے اپنی مرتب کردہ کتاب ''خطبات قائداعظم'' میں یوں پلٹا کھایا :

''دو قومی نظریہ کے اصل خالق سرسید احمد خان تھے۔ انہوں نے بار بار اپنی تقریروں اور بیانات میں اعلان کیا کہ مسلمان

ایک جداگانہ قوم ہیں اور وہ اپنی انفرادیت کا تحفظ چاہتے ہیں۔ در حقیقت پاکستان کی خشتِ اول یہی تھی۔"(۲۵)

دونوں تحریروں کا موازنہ کیجئے کہ موصوف کس طرح خود بیان کردہ "غدر کے بعد بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں کی پہلی آواز" کا گلا گھونٹ کر انیسویں صدی میں جا پہنچے اور سر سید کے بیانات کو جداگانہ قومیت یا قومی انفرادیت کی بنیاد قرار دے دیا۔ دراصل پروپیگنڈہ بڑی طاقتور شے ہے جو بڑے بڑوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

غلام احمد پرویز :

ایک فریق سے بے محابا اندھی عقیدت اور دوسرے سے نفرت اور دشمنی کی انتہا کا جذبہ بعض افراد ان کے ہوش و حواس کھو دیتا ہے۔ اس کیفیت میں سچ قبول کرنا ان کے بس میں نہیں رہتا۔ حقائق ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں یا پھر وہ انہیں ارادتاً جاننے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی معلومات کا حدود اربعہ مضحکہ خیز حد تک کم ہو جاتا ہے۔ جب بات کرتے ہیں تو دوسروں کے الفاظ کو اپنے جذبات کی شدت کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔ اس کا عکس سر سید کے بیشتر دینی عقائد کے علمبردار غلام احمد پرویز کی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

"جوں جوں سر سید اپنے مشن میں کامیاب ہوتا جاتا تھا' مولوی صاحبان کی مخالفت شدید سے شدید تر ہوتی جاتی تھی۔ جب انکے کفر کے فتوے اور جھوٹا پروپیگنڈہ کامیاب نہ ہوا تو انہوں نے اس کیخلاف ایک منظم عملی قدم اٹھایا اور علیگڑھ کے بالمقابل ایک دارالعلوم (دیوبند) قائم کر دیا۔"(۲۶)

محض "مولوی صاحبان" سے اپنی نظریاتی چپقلش کے زیر اثر موصوف نے کم علمی کا ثبوت دیا اور انہیں یاد نہ رہا کہ دارالعلوم دیوبند علی گڑھ کالج کے قیام سے قبل ہی موجود تھا۔ ان کے اپنے ممدوح سر سید کے بقول علی گڑھ میں "۲۴ مئی ۱۸۷۵ء روز سالگرہ ملکہ معظمہ..... مدرسہ کھولا گیا۔"(۲۷) جبکہ دیوبند کا مدرسہ ۱۸۶۶ء میں قائم ہوا تھا۔ (۲۸) جولائی ۱۸۶۷ء کے اخبار سائنٹیفک سوسائٹی میں سر سید نے خود اس کی پہلی سالانہ رپورٹ پر تبصرہ تحریر کیا۔ (۲۹) پھر جولائی ۱۸۷۳ء میں اس کی ایک اور سالانہ رپورٹ پر ان کا ایک طویل تبصرہ تہذیب الاخلاق میں شائع ہوا جس میں انہوں نے علما کو جی بھر کر لتاڑا اور اسلامی مدرسوں میں دی جانے والی تعلیم پر کڑے الفاظ میں نکتہ چینی کی۔ (۳۰)

رد عمل کے طور پر سر سید کے خلاف جو استفتا شائع ہوا اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پرویز صاحب کے ارشاد کے برعکس علیگڑھ کالج مدرسہ دیوبند وغیرہ کے "بالمقابل" قائم کیا گیا ہے۔ اسکی متعلقہ عبارت ملاحظہ فرمائیں :-

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ ان دنوں ایک شخص ان مدرسوں کو جن میں علوم دینی اور ان علوم کی جو دین کی تائید میں ہیں تعلیم ہوتے ہیں جیسے مدرسہ اسلامیہ دیوبند اور مدرسہ اسلامیہ علی گڑھ اور مدرسہ اسلامیہ کان پور' ان کو برا کہتا ہے

اور انکی ضد میں ایک مدرسہ اپنے طور پر تجویز کرنا چاہتا ہے ... مسلمانوں کو ایسے مدرسے میں چندہ دینا درست ہے یا نہیں؟" (۳۱)

موصوف غلط حوالے کے ساتھ کسی اور موقع پر کہے گئے سر سید کے الفاظ کو اپنے مقصد کے مطابق ڈھالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ

"سر سید نے ۱۸۶۵ء میں کہا تھا کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں بستی 'مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں بستی ہیں" (۳۲)

حالانکہ اس انداز میں انہوں نے کبھی کوئی بات نہیں کی۔ اس کے علاوہ ایک تحریر میں وقوعہ ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد کی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک سنی سنائی بات دہراتے ہیں کہ "مسلمانوں کے علمائے کرام نے فتویٰ دے رکھا تھا کہ انگریزی کا پڑھنا حرام ہے۔" (۳۳) حوالے کے بغیر اس الزام میں بھی "مولوی صاحبان" سے محض دشمنی کا رنگ جھلکتا ہے۔ موصوف کے پیروکاروں کو چاہیے کہ وہ اپنے دینی رہنما کے ان بیانات کی تائید میں مستند حوالے پیش کر کے مرحوم کی روح کو سکون پہنچائیں اور ثواب دارین حاصل کریں۔

ڈاکٹر بیگم ممتاز معین الحق :

سر سید کے متعلق ایک مضمون میں ڈاکٹر بیگم ممتاز معین الحق تحریر کرتی ہیں کہ انہوں نے واضح الفاظ میں اس امر کا اعلان کیا کہ

"مسلمان ایک الگ قوم ہیں جو کسی صورت میں ہندو اکثریت میں ضم نہیں ہو سکتی۔ مذہبی اعتقادات اور عبادات کے طریقے 'سماجی رسوم 'تہوار اور رہن سہن کا انداز 'غرض زندگی کے ہر شعبہ میں دونوں قوموں میں بنیادی اختلاف پائے جاتے ہیں۔" (۳۴)

محترمہ موصوفہ نے اس بیان میں بانی پاکستان محمد علی جناح کی ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کی تقریر کے الفاظ و معانی کو سر سید سے زبردستی منسوب کر دیا ہے۔ حالانکہ سر سید کی عمر بھر کی تقریروں یا تحریروں میں اس سے برعکس مفہوم پایا جاتا ہے۔ سر سید کی وفات کے چند ماہ قبل ۱۲ جون ۱۸۹۷ء کے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں شائع ہونے والے ان کے مضمون سے ان کی فکر کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے جس میں وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بابت یہ تحریر کرتے ہیں :۔

"بہت سے ایسے مسلمان ہیں جن میں آریاؤں کے خون کا میل ہے 'بہت سے ایسے ہیں جو خالص آریہ کہلائے جا سکتے ہیں۔ صدیاں گزر گئیں کہ ہم دونوں ایک ہی زمین پر رہتے ہیں 'ایک ہی زمین کی پیداوار کھاتے ہیں 'ایک ہی زمین کا یا دریا کا پانی پیتے ہیں۔ ایک ہی ملک کی ہوا کھا کر جیتے ہیں 'پس مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ مغائرت نہیں ہے۔ جس طرح آریا قوم کے لوگ ہندو کہلائے جا سکتے ہیں۔ ہم نے متعدد دفعہ کہا ہے کہ ہندوستان ایک خوبصورت دلہن ہے اور ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں۔ اسکی خوبصورتی اس میں ہے کہ اسکی دونوں آنکھیں سلامت و برابر رہیں۔ اگر ان میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ خوبصورت دلہن بھینگی ہو جائیگی۔ اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہو جائے گی۔ ہم دونوں کی سوشل حالت قریب قریب ایک ہی سی ہے بلکہ بہت سی عادتیں اور رسمیں ہم مسلمانوں میں ہندوؤں کی آگئی ہیں۔ پس جس قدر ان دونوں قوموں میں زیادہ تر محبت 'زیادہ تر اخلاص 'زیادہ تر ایک دوسرے کی امداد بڑھتی جائے اور ایک دوسرے کو مثل ایک بھائی کے سمجھیں 'کیونکہ ہم وطن بھائی ہونے میں تو کچھ شبہ نہیں 'اسی

قدر ہم کو خوشی ہوتی ہے...... "ہم نے سنا ہے کہ بریلی میں ہندو مسلمانوں نے نہایت خوبی سے ایک دوسرے کی محبت کا ثبوت دیا ہے یعنی بقر عید کے روز مسلمانوں نے گائے کی قربانی نہیں کی...... ہماری بھی مدت سے یہی رائے ہے کہ اگر گائے کی قربانی ترک کرنے سے آپس میں ہندواور مسلمانوں کی دوستی اور محبت قائم ہو تو گائے کی قربانی نہ کرنا اسکے کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔"(۳۵)

ڈاکٹر سید معین الحق :

ہمارے بعض قلم کاروں کا یہ المیہ ہے کہ وہ جہاں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ذکر میں قومی جذبات کے مطابق غلط یا صحیح کی درست نشاندہی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں' وہاں جب سر سید کا معاملہ ہو تو موصوف کے عوام دشمن نظریات واقدامات سے اختلاف کرتے ہوئے بھی ان کے حق میں جوازات تلاش کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔ وہ اس مقصد کیلئے غلط بیانی سے بھی گریز نہیں کرتے۔ دوسرے الفاظ میں قومی جذبات کی ترجمانی کا لہجہ صرف اور صرف اس لئے اختیار کیا جاتا ہے کہ قارئین کو اچھا تاثر دے کر انہیں نفسیاتی طور پر سر سید کے دفاع کے حق میں تیار کیا جائے۔ یہ طریقہ واردات سر سید کے شیدائی قلم کاروں کا محبوب مشغلہ ہے۔ اس کا عکس ڈاکٹر معین الحق کی مندرجہ ذیل تحریر میں بخوبی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

"انقلاب کے وقت سید احمد خان کی عمر چالیس سال تھی اور ان کی حیثیت ایک سرکاری ملازم سے زیادہ نہ تھی۔ اس وقت ان کے سامنے اصلاحی پروگرام کا بھی کوئی منصوبہ نہ تھا' اس لئے یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ سید احمد خان کسی سیاسی مصلحت یا منصوبہ کے تحت نہیں بلکہ حقیقتاً یہ سمجھتے تھے کہ انقلاب دراصل انقلاب نہیں بلکہ "بغاوت" ہے۔ انقلابیوں کی شکست اور اس کے بعد مسلمانوں کی تباہی و بربادی نے ان کو اس عقیدہ میں اور بھی پختہ کردیا۔ چنانچہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا' ان کا یہ عقیدہ پختہ تر ہوتا گیا۔ کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب "بغاوت" اور غدر" سے زیادہ کچھ نہ تھا"۔

"اس میں شک نہیں کہ آج ہماری رائے میں سید احمد خان کا یہ عقیدہ اور اسکی بنا پر انہوں نے جو رویہ اختیار کیا' یقیناً غلط ہے لیکن بحیثیت ایک مورخ کے ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی غلط اجتہادی تھی اس کے پیچھے کوئی ذاتی غرض یا مقصد نہ تھا۔ سید احمد خان کا جذبہ ایثار بے مثال تھا۔ جنگ آزادی کے اختتام پر حکومت نے انکی وفاداری کے سلسلہ میں انکو پنشن کے علاوہ ایک جاگیر بھی عطا کرنے کا ارادہ کیا لیکن انہوں نے پنشن تو قبول کرلی مگر جاگیر نہیں لی' اس وجہ سے کہ یہ جاگیر ایک باعزت مسلم خاندان کی ضبط شدہ جائیداد تھی۔ سید احمد خان کے اس ایثار کا مورخ تذکرہ تو کرتے ہیں' لیکن اس سے جو نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے اسکی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انکی وفاداری کا رویہ کسی غرض یا فائدہ کی بنیاد پر نہ تھا بلکہ انکی یہ ایمانداری کی رائے تھی' اگرچہ غلط تھی۔ بہر حال سید احمد خان اس انقلاب کو بغاوت ہی سمجھتے تھے' اور ہمیشہ ان کا یہی خیال رہا۔ اس رائے میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اسکے علاوہ یہ بات بھی ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ سید احمد خان کے خیال میں جن مسلمانوں نے اس انقلاب میں حصہ لیا انہوں نے سخت غلطی کی۔ وہ انکی قربانیوں کو قدر کی نہیں بلکہ افسوس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کو مسلمانوں کی تباہی کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان پر نہایت سخت اور بعض اوقات ناروا الفاظ میں تنقید کرتے ہیں' مثلاً محمود خان کو جو بجنور کے انقلابی رہنما تھے وہ "نامحمود" کہتے ہیں' اسی طرح بہادر شاہ ظفر کا ذکر انہوں نے بہت برے الفاظ میں کیا ہے۔(۳۶)

صاحب تحریر کا یہ بیان کہ "حکومت نے ان کی وفاداری کے سلسلہ میں ان کو پنشن کے علاوہ ایک جاگیر

بھی عطا کرنے کا ارادہ کیا لیکن انہوں نے پنشن تو قبول کر لی مگر جاگیر نہیں لی'' سر سید کو اس امر میں قوم کا خیر خواہ ظاہر کرنے کی ایک ناکام کوشش ہے۔ اول تو جاگیر ''عطا کرنے'' کے الفاظ بالواسطہ طور پر فرنگی اقدامات کی تکریم میں قلم کار کے ذہن کی عکاسی کرتے ہیں جب کہ پنشن کے ''علاوہ'' جاگیر پیش کرنے کے ارادے کا ذکر قطعی غلط ہے۔ سر سید کا قد کاٹھ بلند کرنے کی اس ''کہانی'' کو انہوں نے اگلے صفحات میں یوں بیان کیا ہے :

''جنگِ آزادی کے دوران سید احمد خان نے حکومت کی جو خدمات انجام دی تھیں انکے صلہ میں پنشن کے علاوہ شیکسپئر یہ چاہتے تھے کہ چاند پور کے علاقے میں ایک جاگیر کیلئے بھی سفارش کریں لیکن سید احمد خان نے منع کر دیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک مسلمان بھائی کی ضبط شدہ جائیداد میں سے انعامی جاگیر قبول کریں۔ مصلحتاً انہوں نے یہ بہانہ کر دیا کہ وہ ہندوستان میں قیام نہیں کرنا چاہتے۔ (۳۷)

حقیقت یہ ہے کہ سر سید نے مصلحتاً کوئی بہانہ نہیں کیا۔ سر سید کے خود اپنے بیان سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ جاگیر کی پیشکش کے جواب میں وہ اپنے ردعمل کا اظہار یوں کرتے ہیں :

''میں نے اسکے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے اور در حقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔''(۳۸)

لطف کی بات یہ ہے کہ خود صاحب سر سید کو ایک دوسرے پہلو سے بلند قامت بنانے کے لئے اپنے ہی بیان کے برعکس اس طرح تحریر کرتے ہیں :

''مسلمانوں کی تباہی سید احمد اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور اس کا اثر انکے دل پر اس قدر زیادہ ہوا کہ ایک موقع پر جلاوطنی اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن بعد میں اس ارادہ کو ترک کر کے قوم کو تباہی سے بچانے کی کوشش کرنے کی طرف توجہ کی''(۳۹)

یعنی محض سر سید کو ہر لحاظ سے عظیم بنانے کے لئے دو متضاد پہلوؤں میں تعریف و توصیف کی گنجائش نکال لی گئی۔ یہ فن شخصیت پرستی کی خالص پیداوار ہے۔

جہاں تک پنشن کا تعلق ہے تو دراصل سر سید کے ارادہ ترک وطن کو مدنظر رکھتے ہوئے جاگیر کی پیشکش قبول نہ کرنے کے عوض اس کی معقول مقدار متعین کی گئی۔ کلکٹر و مجسٹریٹ بجنور کی سرکاری رپورٹ سے اس کی توضیح یوں ہوتی ہے۔

''مناسب ہے کہ پنشن دو سو روپیہ ماہواری 'خواہ دائمی ہو خواہ حین حیات' انکے اور انکے بیٹے کے سرکار سے عنایت ہو۔ اور یہ تجویز اس نظر سے ہے کہ ہم کو معلوم ہے کہ سید احمد خان کا ارادہ ہے کہ بعد چند سال کے سیر اقالیم کی کریں اس سبب سے زمینداری لینا منظور نہیں۔''(۴۰)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ دو نسلوں تک دو سو روپے ماہواری پنشن کی مقدار' جو اپنے زمانے میں بلا شبہ ایک ''جاگیردارانہ پنشن'' تھی سر سید کو جاگیر وصول نہ کرنے کی عوض منظور کی گئی لہذا ''باعزت مسلم خاندان کی ضبط شدہ جائیداد'' پیشکش کو قوم کی غمخواری میں ٹھکرا دینے کے افسانے قارئین کو محض گمراہ کرنے کی سازشیں ہیں۔

متذکرہ بالا بحث میں ہم نے ملاحظہ کیا کہ اول سر سید کی مبینہ "خدمات" کو بے غرض ظاہر کرنے کیلئے ان سے "مصلحتاً ترک وطن کے بہانے" کی آڑ میں جاگیر ٹھکرائی گئی جبکہ صورت دوم میں ترک وطن کے ارادہ کا بہانہ یا ونہ رہا تو "قوم کو تباہی سے بچانے کی خاطر" ان سے جلاوطنی کے ارادے کو ترک کروانا پڑا۔ شاید دانشوری اسی کا نام ہے کہ اپنی دانش کے زور سے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ دکھایا جائے۔

.....

اشارات

۱۔ تفسیر القرآن (۱۹۹۴ء) تعارف صفحہ اول
۲۔ حیات جاوید (۱) ص ۸۹
۳۔ تفسیر القرآن (۱۹۹۴ء) تعارف صفحہ دوم
۴ ایضاً، صفحہ اول
۵۔ نقطہ نظر اسلام آباد (اپریل تا ستمبر)، ص ۳۰۔۳۱
۶۔ القرآن (۱۹۹۸ء) تعارف صفحہ اول
۷۔ تہذیب الاخلاق علی گڑھ (جمادی الاول ۱۲۸۹ھ)
۸۔ اسباب بغاوت ہند (۱۹۸۵) ص ۶۸۔
۹۔ ایضاً (۱۹۹۱) ص ۶۸
۱۰۔ ایضاً (۱۹۵۸) ص ۳
۱۱۔ ایضاً (۱۹۸۵) ص ۶۸
۱۲۔ مقالات یوم شبلی، ص ۶۹
۱۳۔ خطبات احمدیہ، ص ۳۵۲
۱۴۔ تذکرہ اہل دہلی، ص ۳۰
۱۵۔ حیات جاوید (۲) ص ۱۳
۱۶۔ اردو کی علمی ترقی میں سر سید..... ص ۶۳
۱۷۔ حیات جاوید (۲) ص ۳۴۰
۱۸۔ ایڈریس اور اسپیچیں، ص ۷۲
۱۹۔ مکمل مجموعہ لکچرز، ص ۲۴
۲۰۔ سرکشی ضلع بجنور، ص ۱۴۱
۲۱۔ اردو کی علمی ترقی میں سر سید..... ص ۷۵
۲۲۔ ایضاً، ص ۷۶۔ ۲۳۔ ایضاً، ص ۱۳۱
۲۴۔ حیات محمد علی جناح، ص ۵۳۸۔۵۳۹
۲۵۔ خطبات قائداعظم، ص ۵۶۷
۲۶۔ تہذیب کراچی (نومبر ۱۹۹۸)، ص ۲۰
۲۷۔ مکمل مجموعہ لکچرز، ص ۴۰۵
۲۸۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند، ص ۱۵۵
۲۹۔ تحریک علی گڑھ تا قیام پاکستان، ص ۶۸۔
۳۰۔ مقالات سر سید (۷) ص ۲۷۸
۳۱۔ سر سید احمد خان (سیاسی مطالعہ) ص ۱۳۴
۳۲۔ قائداعظم کا تصور پاکستان، ص ۱۹
۳۳۔ تہذیب کراچی (نومبر ۱۹۹۸ء) ص ۱۷
۳۴۔ سر سید علیہ الرحمہ، ص ۷۵
۳۵۔ آخری مضامین، ص ۵۵
۳۶۔ سرکشی ضلع بجنور (مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق) ص ۲۱ تا ۲۳
۳۷۔ ایضاً، ص ۳۵
۳۸۔ مکمل مجموعہ لکچرز، ص ۳۹۹
۳۹۔ سرکشی ضلع بجنور (مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق) ص ۱۰۵
۴۰۔ لائل محمڈنز آف انڈیا (۱) ص ۵۵